OPEN ACCESS
Al-Qamar
ISSN (Online): 2664-4398
ISSN (Print): 2664-438X
www.alqamarjournal.com

رند لکھنوی: ایک منفرد کلاسیکی غزل گو

Rind Lakhnavī: A Different Classical Ghazal Poet

Dr. Zahira Nisar

Dr. Zahira Nisar, Senior Editor cum Assistant Professor,
Department of Urdu Encyclopaedia of Islam, Allama Iqbal Campus,
University of the Punjab Lahore

Abstract

Rind was a famous disciple of Aātish- His poetry depicts lakhnawī classical thoughts. His Diwān consisted different styles of poetry like Ghazal, Masnavī, Rubaī, Qaṭ'āt and wasokht etc. But his main field of poetry is Ghazl. His Ghazal has two different shades of lakhnawī culture, first which was the general trend of the society and second is his own variation which he adapts side by side the general trend- These typical variations like simplicity short rhythm clearly seen in Meer's poetry- In that's way he proved himself a versatile poet which amused his readers and remind them the typical style of Meer. We simply tell him the true follower of Meer. In this article various aspects of his poetry (both style and subject) will be highlighted.

Key Words: Imām Mūsa Kāzim, Muhammad Yousuf blind, Faiz Aābad, Bahū Begum, Nawwāb, Shuja-ud- Dola

تمہید

رند آتش کے نام ور شاگردوں میں سے ایک ہیں۔ اُن کی شاعری مخصوص لکھنوی طرزِ ادا کی نمائندہ ہونے کے باوجود اُن کے اپنے مخصوص آہنگ کے سبب ممتاز ہے۔ انھیں غزل، مثنوی، قطعہ، رباعی غرض ہمہ قسم اصناف پر سخن گوئی کی قدرت حاصل تھی۔ تاہم وہ غزل کے مردِ میدان تھے۔ انھوں نے معاشرے کے مروجہ شعری انداز کی تقلید کے ساتھ ساتھ سادگی بیان اور

CC BY

مختصر بحروں کے استعمال سے رنگِ میر کو زندہ کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ وہ صاحبِ دیوان شاعر تھے اور اپنی شاعری کے توسط سے وہ قارئین کو موضوع اور اسلوب ہر دو لحاظ سے مسحور کرتے ہیں۔ انھیں مقلدِ میر کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ اس مقالے میں رند کے رنگِ شعری کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی۔

سلسلۂ نسب و آباؤاجداد

رندؔ کا سلسلۂ نسب ۲۱ واسطوں سے امام موسیٰ کاظم سے جاملتا ہے۔ ہندوستان آمد سے قبل ان کا خاندان ایرانی بادشاہ کے تقرب میں تھا۔ رندؔ کے دادا مرزا محمد یوسف کی شجاعت کے چرچے تھے۔ بادشاہِ ایران نادر شاہ نے اُن کی اسی بہادری کے خوف سے کہ کہیں وہ اُن کے مدِّمقابل نہ آجائیں انھیں دھوکے سے گرفتار کروا کے اندھا کروادیا۔ یہی سبب ہے کہ تاریخ میں رندؔ کے دادا محمد یوسف کور کے نام سے مشہور ہیں۔ انھوں نے دو شادیاں کیں۔ رندؔ کے والد مرزا غیاث الدین محمد خاں دوسری بیوی مرزا محمد باقر کی بیٹی کے بطن سے تھے۔ وہ روضۂ امام رضاؑ کے فراش خانے کے داروغے کی خدمت پر مامور تھے۔ تاہم بعد ازاں سید امین (سعادت خاں برہان الملک) کے ساتھ ہندوستان آگئے۔ غیاث الدین محمد خاں کو صوبہ داراودھ برہان الملک سے قرابت کے باعث قدر و منزلت حاصل تھی، انھیں سراج الدولہ کا خطاب بھی دیا گیا تھا۔ غیاث الدین کی بھی دو شادیاں ہوئیں۔ نواب نجف خاں ذوالفقار الدولہ کی بڑی صاحب زادی سے رندؔ تولد ہوئے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری رندؔ کے والد کی بابت لکھتے ہیں:

> "..... سراج الدولہ فارسی میں شعر کہتے تھے اور قیامتؔ تخلص کرتے تھے۔ ان کا کلام نایاب ہے اور کسی تذکرے میں درج نہیں ہے۔ حالاتِ زندگی بھی بہت کم دستیاب ہیں۔ وہ فنِ انشا پردازی، نکتہ پیرائی اور سخن آرائی میں ید طولیٰ رکھتے تھے....."[1]

گویا رندؔ کو شاعری کا فن ورثے میں ملا۔ رندؔ کو اپنی خاندانی عظمت و برتری پر ناز تھا۔ اُن کے دادا مرزا محمد یوسف ایران کے نامور اصحاب میں شمار ہوتے تھے جب کہ نانا نجف خاں ذوالفقار الدولہ، شاہ عالم ثانی کے وزیر تھے۔ سعادت خاں برہان الملک سے قریبی مراسم کا یہ عالم تھا کہ جب اس نے فیض آباد میں صوبہ دار کی حیثیت سے اپنا دارالخلافہ تعمیر کیا تو رندؔ کا خاندان بھی دہلی سے فیض آباد آگیا۔ چنانچہ رندؔ کی پیدائش فیض آباد میں ہوئی۔

پیدائش و تعلیم و تربیت

سید محمد خاں رند بروز جمعہ ۱۱/ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ/ ۱۷۹۷ء کو پیدا ہوئے۔ اپنی تاریخِ پیدائش پر انھوں نے درجِ ذیل معروف قطعۂ تاریخ کہا ہے:

میں روز و ماہ و سال اپنے تولد کا بتاتا ہوں
وہ رکھیں یاد تحقیقات جن لوگوں کی عادت ہے
سنہ ہجری پہ تھے بارہ سو بارہ جمعہ کا دن تھا
ربیع الاول کی گیارھویں رندِ ولادت ہے[2]

رندؔ کے بچپن میں ہی والدین کا سایہ سر سے اُٹھ گیا اس محرومی کا انھیں تاحیات قلق رہا۔ چناں چہ نواب شجاع الدولہ کی زوجہ بہو بیگم نے قرابت داری کی بناء پر اُن کی پرورش اور تعلیم میں دل چسپی لی۔ اس طرح بہو بیگم کے آسرے سے بے آسرے پن کے مصائب دور ہو گئے۔ سکسینہ لکھتے ہیں:

"..... ان کے والد نواب برہان الملک سعادت خاں کے حقیقی بھانجے تھے اس واسطے بہو بیگم کے دامنِ تربیت میں ناز و نعمت سے پرورش پائی..... [3] "

نمودِ ذوقِ شعری

رند کی شاعری اس مزاج میں اسی شاہی ماحول محلات کی رنگینی رچ بس گئی تھی جس میں انھوں نے اپنی زندگی کے اٹھائیس برس گزارے تھے۔ پھر بہو بیگم خوش طبع و خوش سلیقہ ہونے کے ساتھ ساتھ ذوقِ شعری بھی رکھتی تھیں اور خود شعر بھی کہتی تھیں۔ شجاع الدولہ شعراء کے قدر دان تھے۔ اُن کے داماد محمد تقی خاں ترقیؔ نہ صرف خود شاعر تھے بلکہ اپنے دیوان خانے پر محافلِ شاعری آراستہ کرتے تھے۔ میر مستحسن خلیقؔ، رشکؔ جیسے استاد شعراء اُن کے دامنِ دولت سے وابستہ تھے۔ رندؔ کی پرورش اسی علمی و ادبی ماحول میں ہوئی۔ چناں چہ اُن کے ہاں ذوقِ شعری کی نمود فطری اور ابیاتِ عاشقانہ سے لطف اندوزی یقینی تھی۔ رندؔ نے رسمی تعلیم حاصل نہیں کی، البتہ روز و شب استاد شعراء کے اردو و فارسی دواوین اُن کے زیرِ مطالعہ رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے دیوانِ اوّل کے خاتمے پر اسی کیفیت کا اظہار درجِ ذیل الفاظ میں کیا ہے:

"..... این بے مایۂ ہیچ میرزا را از ایام صبی سودائے شعر و سخن در سر بود و روز و شب بہ مطالعہ دواوین اساتذہ متقدمین چہ فارسی وچہ ہندی صرف اوقات می نمود و اصلا بہ تحصیل کتب درسی نمی پرداخت و ابیات عاشقانہ پیش از حد و زیادہ از عد از بر نمودہ..... "[4]

شاگردیِ اوّل و دوم

رندؔ کو ذوقِ شعری فطری طور پر ودیعت ہوا تھا اس لیے درسی علم کے حصول کے بغیر بھی انھوں نے اپنے فطری ذوق، درباری ماحول میں نشو و نما اور سب سے بڑھ کر میر خلیقؔ جیسے باکمال استاد کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کر کے اردو شاعری میں جواہر پارے تخلیق کیے۔ بہو بیگم کی وفات کے نو سال بعد تک وہ فیض آباد میں مقیم رہے اور وفاؔ تخلص اختیار کیے رکھا۔ ۱۷۷۴ء میں شجاع الدولہ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے آصف الدولہ نے جب لکھنؤ کو اپنا دارالسلطنت بنایا تو تمام ہندوستان سے شعراء اور اہل کمال لکھنؤ کھنچتے چلے آئے [5]۔ بالآخر ۱۲۴۰ھ/۱۸۲۵ء کو رند لکھنؤ آ گئے جہاں انھیں آتشؔ جیسا قادر الکلام استاد میسر آیا۔ یہیں آ کر آتشؔ کے ایماء پر وفاؔ کے برعکس رندؔ تخلص اختیار کیا اور پھر تاحیات رندؔ ہی رہے۔ رندؔ کے لکھنؤ آنے کا سبب ایک جانب تو بہو بیگم کی وفات سے پیدا ہو جانے والا خلا تھا دوسرا میر خلیقؔ کے فرخ آباد چلے جانے پر انھوں نے بھی دیگر اہلِ کمال کے لکھنؤ چلے جانے کی طرح لکھنؤ چلے جانے کو ترجیح دی۔ اپنے تخلص رندؔ اور آتشؔ کی شاگردی اختیار کرنے کی بات لکھتے ہیں:

"از حسن اتفاقات باجناب مولانائے معظم و مکرم زبدۂ شعرائے عالم خلاق المعانی نہنگ بحر سخندانی غواص بحر کمال فارس مضمار سحر جلال صیرفی دینار بلاغت محک عیار فصاحت چیکدۂ قلم اعجاز رقمش را اگر مغز قلم گویم بجاست و زادگان طبع و قادش را اگر یوسف وقت خوانم زیباست ابلغ البافا افصح الفصحا جناب خواجہ حیدر علی صاحب متخلص بہ آتش مدظلہ العالی ملاقات اتفاق افتاد بصد شوق و کمال ذوق استدعائے تلمذ بخدمت فیض موہبت شان نمودم از وفور مہربانیہا و اقتضائے حسن اخلاق..... داخل زمرۂ شاگردان عقیدت گزیں و حلقۂ بگوشان ارادت آئین گشتہ استفادۂ غزل گوئی از جناب مغرالیہ حاصل کردہ و میکنم و تخلص خود کہ اسم با مسمیٰ یافتم حسبِ ارشاد جناب مخدومی رند قرار دد..... "[6]

رندؔ نے آتشؔ کی شاگردی اختیار کرنے کے بعد سابقہ کلام کو جسے میر خلیقؔ کی سند حاصل تھی اُسے چاہ برد کر دیا تھا۔ یہ یاد رہے کہ میر خلیقؔ اور آتشؔ دونوں ہی مصحفیؔ کے شاگرد تھے۔ چاہ برد کیے گئے اس کلام میں مرثیے، سلام، رباعیاں اور غزلیں شامل

تھیں۔ فیض آباد اور لکھنؤ کی فضا اور ماحول کے تفاوت میں نئے مضامین کی ناگزیر نمود کے سبب بھی ایسا ہونا فطری دکھائی دیتا ہے۔ آتش کی شاگردی میں رند نے دو دواوین تیار کیے اور تمام عمر قلندرانہ شان کے ساتھ زندہ رہے اور کبھی کوئی شاگرد نہ بنایا۔

لکھنؤ آمد

رند ۱۲۴۰ھ / ۱۸۲۴ء کو لکھنؤ وارد ہوئے تو اُس وقت غازی الدین حیدر اودھ کی خود مختار ریاست پر تخت نشین ہو چکے تھے۔ آتش جیسے سخن ور کی استادی میں رند کا رنگِ سخن نہ صرف نکھرا بلکہ معاصر شعراء میں ممتاز مقام حاصل کرنے کا باعث بھی ہوا۔ رند نے اپنے استاد کی مدح وستائش میں جگہ جگہ اظہارِ خیال کیا ہے:

عیب سے پاک و مبرّا ہے کلام ان کا رند
جو غزل حضرتِ آتش کو دکھا لیتے ہیں

کس طرح سے نہ فنِ شعر میں کامل ہو رند
دس برس دیکھی ہو آتش سے جب استاد کی آنکھ

شاعرِ قادر الکلام

سبھی ناقدین رند کی سخن فہمی و سخن شناسی پر کامل دست رس کے معترف ہیں۔ سید سلیمان حسین لکھتے ہیں: ".....رند کی شاعری کے شباب کا زمانہ وہ تھا جب کہ سارا لکھنؤ شعر کی ظاہری خوبیوں، مرکب تشبیہات، پیچیدہ تمثیل..... ژولیدہ تخیل، مبالغے اور رعایت لفظی کے جال میں پھنسا ہوا تھا اور شاید اسی کو شاعری کا اصل مقصود سمجھ لیا گیا تھا۔ رند..... نے اس کے برعکس اپنے کلام کی بنیاد سادگی، سلاست اور صفائی پر رکھی ہے"[7] رام بابو سکیسنہ لکھتے ہیں:

".....کلام ان کا نہایت صاف اور سادہ ہے جس میں محاورات کی برجستگی و تاثیر کا رنگ جھلکتا ہے..... مذاقِ شعر بہت سلیم ہے اور ان کے اشعار مہذب کانوں پر ناگوار نہیں ہوتے۔ کچھ ایسے بھی اشعار پائے جاتے ہیں جن میں روحانیت اور تصوف کی جھلک ہے۔"[8]

وفات

رند کی درست تاریخ وفات کا تعین کرنا دشوار ہے۔ گو انھوں نے تمام عمر شاعری، عیش و عشرت اور شراب و نشاط میں بسر کی تاہم اخیر عمر وہ مذکورہ تعیشات سے تائب ہو گئے تھے حتیٰ کہ شاعری بھی ترک کر دی تھی۔ اسی سلسلے میں انھوں نے شفیقہ کے نقشِ قدم کی پیروی میں سفر حرمین کی تیاری بھی کی تھی۔ مختلف تذکروں میں اس بات کی خبر ملتی ہے:

"رند بہ سلسلہ حج و زیارتِ عتباتِ عالیات ۱۲۷۴ھ / ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ سے روانہ ہوئے۔ ابھی بمبئی تک ہی پہنچے تھے کہ ملک میں ہر طرف انتشار پھیل گیا اور آگے نہ جا سکے۔ وہیں کسی مہلک مرض میں مبتلا ہوئے اور انتقال ہو گیا"۔[9]

سید کمال الدین حیدر نے لکھا ہے کہ "وہ بے اولاد عارضۂ جذام سے مر گیا، قصدِ زیارت کربلائے معلّٰی کیا تھا نہ جا سکا"[10]۔ لالہ سری رام، سکسینہ وغیرہ جیسے مؤرخین نے بھی رند کی تاریخِ وفات درج نہیں کی۔ تاہم ڈاکٹر سید سلیمان حسین نے "تذکرۂ گلستانِ سخن" اور "تذکرۂ سراپا سخن" کو بنیاد بناتے ہوئے اُن کے دیوان کی اشاعت کے چند ماہ بعد ۱۲۶۸ھ / ۱۸۵۲ء کی کوئی تاریخ رند کی تاریخِ وفات قرار دی ہے[11]۔ لالہ سری رام نے کلام رند کی دل کھول کر ستائش کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں اردو شاعری کے قد آور شعراء کے مقابل لا کھڑا کیا ہے:

"یہ رجب ۱۲۴۰ھ میں لکھنؤ آئے اُس وقت یہ دارالسلطنت بھی علم و فضل کا مخزن، شاعری و ثاری کا معدن، زبان و محاورات و فصاحت و بلاغت کی ٹکسال تھا۔ اس باکمال عہد میں فنِ شاعری میں کامل ہو جانا ہر شخص کے لیے ایک ادنیٰ توجہ سے ممکن تھا، نہ کہ رندؔ جیسے ذہن، طباع، نکتہ رس، عاشق مزاج کے لیے جو لکھنؤ وارد ہونے سے قبل ہی اپنے ہم چشموں سے کچھ بہت نیچے نہ تھا....."[12]

عبدالغفور نساخؔ نے رندؔ کی شعر گوئی کی درج ذیل خوبیاں گنوائی ہیں: "..... شعر صاف و عاشقانہ اچھا کہتے ہیں۔ کلیات ان کا نظر سے گزرا ہے"۔[13] لالہ سری رام رندؔ کے کلام کی خوبیاں گنواتے ہوئے لکھتے ہیں:

"محاورات و روزمرہ، شوخی و طرازی، فصاحت و سادگی، تاثیر اور معنی آفرینی کے جوہر کو قسامِ ازل نے رندؔ میں خاص طور پر ودیعت کر رکھا تھا۔ معاملاتِ راز و نیاز میں کوئی جگ بیتی کہتا ہو گا مگر رندؔ آپ بیتی کہتا تھا۔ ان کا مجموعۂ غزلیات اُن تمام رندانہ، عاشقانہ، مضامین کا گنجینہ ہے جو ایک مہذب زبان کے دل کش لفظوں میں ہونا چاہیے باایں ہمہ درد و غم، تصوف و معرفت، تربیت و اخلاق، حکیمانہ و فلسفیانہ رنگ کی چاشنی ان کے کلام میں موجود ہے..... وہ کبھی تو میرؔ و سوداؔ کے مقابل آتے ہیں کبھی بہ اندازِ جرأتؔ و مصحفیؔ مترنم ہوتے ہیں یا مومنؔ و غالبؔ کا طرزِ بیان اختیار کرتے ہیں اور کبھی نواب مرزا شوقؔ کی زبان بولتے ہیں....."[14]

آتشؔ و ناسخؔ اور رندؔ کے اختلاف کا قصہ

رندؔ کی قادرالکلامی کے ضمن میں ایک واقعہ تقریباً سبھی ناقدینِ رندؔ کے ہاں مذکور ہے۔ مولانا محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" میں اس قصے کی تان ٹوٹتی ہے۔ ایک طرحی غزل جس کا قافیہ "میلا" تھا، نظم کرنا لازم تھا۔ رندؔ نے کمال استادی سے غزل کہی اور استاد سے اس مشکل قافیے کی داد وصول کرنا چاہی ساتھ یہ بھی کہا کہ "میلا" جیسا دشوار قافیہ اس سے بہتر باندھنا ممکن نہیں۔ رندؔ کا اس غزل کا مشہور شعر ہے:

اگر ئی کا ہے گماں، شک ہے ملاگیری کا
رنگ لایا ہے دوپٹہ تیرا میلا ہو کر

آتشؔ نے یہی قافیہ جب میر وزیر علی صباؔ سے نظم کروا کر مشاعرے کے لیے تیار غزل پڑھنے کا کہا:

باغباں بلبلِ کشتہ کو کفن کیا دیتا
پیرہن گل کا نہ اُترا کبھی میلا ہو کر

"تو آتش نے رند کو مخاطب کر کے کہا 'دیکھیے نواب صاحب قافیہ یوں نظم کرتے ہیں'۔ رندؔ کو آتشؔ کے یہ الفاظ سخت ناگوار گزرے اور انھوں نے اپنے استاد کی خدمت میں آنا جانا چھوڑ دیا..... برقؔ کے ساتھ شیخ صاحب کے پاس آئے"[15]

تاہم ناسخؔ نے کمال استادی کا ثبوت دیتے ہوئے استاد و شاگرد کے مابین صلح کروادی۔ مولوی کیفی چڑیاکوٹی نے بھی کلامِ رندؔ کی سادگی و گداز کو بے حد سراہا ہے:

"..... پہلے وفاؔ تخلص تھا آتشؔ نے رندؔ کر دیا، کلام میں سادگی کے ساتھ گداز ہے، اکثر جگہ سوزؔ میں آتشؔ کا رنگ نمایاں ہے....."[16]

شادی و اولاد

رندؔ نواب مرزا سیتو کی دختر کے عقد میں آئے تاہم تمام عمر اولاد سے محروم رہے۔

تلامذۂ آتشؔ اور رندؔ

آتشؔ کے تلامذہ میں خلیلؔ، صباؔ اور نسیمؔ نے خوب نام کمایا۔ پنڈت دیا شنکر نسیمؔ کا نام گلزارِ نسیم کے سبب امر ہو گیا۔ خلیلؔ اور صباؔ کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا کہ وہ رندؔ سے اعلیٰ پائے کے شاعر تھے۔ منشی امیر احمد نے تذکرۂ رندؔ میں اس قضیے کا یہ حل پیش کیا ہے کہ خلیلؔ کا اعلیٰ درجے کا کلام پردۂ اخفا میں جانے کے سبب اس قسم کا موازنہ ممکن نہیں ہے:

> "..... سن رسید بزرگ تو جلیلؔ اور صباؔ کو رندؔ سے افضل بتاتے ہیں لیکن بیسویں صدی میں اس دعوٰی کا ثابت کرنا دشوار ہے۔ کیوں کہ خلیلؔ کا جو کلام اس مرتبے کا تھا کہ آتشؔ کے شاگردوں میں اس کو مسندِ فضیلت پر بٹھاتا پردۂ عالم سے معدوم ہو گیا۔ صباؔ کی شاعری کا جو رنگ تھا اُس کے قدر شناس انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔

رندؔ و حیات کی شاعری کا مقابلہ کرنا بہت سہل ہے کیوں کہ دونوں استادوں کے دیوان موجود ہیں....."[17] منشی امیر احمد نے رندؔ اور صباؔ کے اشعار کے تقابل سے ثابت کیا ہے کہ فنِ شعر میں رندؔ، صباؔ پر فوقیت رکھتے تھے۔ ذیل کے مطالعے اور مقطعے کے موازنے کے بعد انھوں نے بڑی متوازن اور جامع رائے پیش کی ہے: "صباؔ کہتے ہیں:

گل کو وہ چھیڑتے ہیں باغ میں آتے جاتے
باتیں بلبل کو ہزاروں سناتے جاتے
اے صباح ہوتے ہیں دنیا میں تماشے کیا کیا
اپنی قدرت کے ہیں وہ کھیل دکھاتے جاتے

رندؔ فرماتے ہیں:

سانس دیکھی تنِ بسمل میں جو آتے جاتے
اور چرکا دیا جلادنے جاتے جاتے
چاہنا ترک کر دیا نہ کرو ہو مختار
نیک و بد رندؔ تمھیں ہم ہیں جتاتے جاتے

کیا اب بھی کوئی شک کر سکتا ہے کہ ان میں سے ایک مطلع ایسا ہے جو مٹ نہیں سکتا جب تک کہ اردو زبان اور اس کے سمجھنے والے پردۂ عالم سے نیست و نابود نہ کر دیئے جائیں....."[18] سب سے بڑھ کر رندؔ کی محاورات گری، شوخی و طرازی، فصاحت و سادگیِ بیان، تاثیر و معنی آفرینی لائقِ مطالعہ ہے۔ جب ان حوالوں سے رندؔ اور صباؔ کے کلام کا تقابل کیا جائے تو رندؔ کا پلڑا بھاری رہتا ہے۔ عشوہ و غمزہ، ناز و ادا کے مضامین کے علاوہ سادہ و سیدھے خیالات کی ادائیگی میں بھی رندؔ کا جواب نہیں ہے۔ اسی سبب سے منشی امیر احمد کا رندؔ کو جان دار خراجِ تحسین پیش کرنا بجا ہے:

> "..... رندؔ و صباؔ دونوں سپہرِ سخن کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ دونوں ایک خاص رنگ کے مالک تھے اور طرزِ خاص پر ایسا تصرف کر لیا تھا کہ جب دوسرا اس راستے میں مقابل آتا تھا تو وہ منہ کی کھاتا تھا لیکن یہ تو کہوں گا کہ آفتاب و ماہتاب کی نسبت ضرور تھی۔ کوئی اپنے ذاتی جوہر سے چمکتا تھا اور کوئی چمکنے والی چیزوں کے عکس سے بہرہ اندوز ہو کر خلقت کو نور بخشتا تھا..... موجودہ زمانے میں شاعری کا جو طرز پسند کیا

جاتا ہے اس کے دیکھتے ہوئے آتش کے شاگردوں میں رند کا نمبر اوّل ہے اور اُس کو فخر استاد کہیں تو کچھ بے جا نہیں"۔[19]

دیوانِ رند

دیوانِ رند دو حصوں پر مشتمل ہے۔ دیوانِ اوّل "گلدستۂ عشق" ۱۲۵۸ھ میں رند نے خود مرتب کر کے شائع کروایا تھا۔ ان کا دیوانِ ثانی بعد از وفات تکمیل و ترتیب کے مراحل سے گزر کر اشاعت پذیر ہوا۔ مروجہ دیوانِ رند جو اُن کے کل کلام پر محیط ہے، نول کشور پریس سے ۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۷ء میں باتصحیح شائع ہوا۔ دیوانِ رند کلاسیکی شعراء کے طرز پر غزل، رباعی، قطعے، قصیدے، مثنوی، واسوخت، مخمس اور مسدس جیسی متنوع اصناف سے آراستہ ہے۔ یہ تمام اصناف اُن کی قادرالکلامی اور کہنہ مشقی کی آئینہ دار ہیں۔ تاہم رند میدانِ غزل کے شہ سوار ہیں۔

غزل گوئی

اودھ بالخصوص لکھنوی شاعری کی نشو و نما میں وہاں کی مخصوص فضا اور تہذیبی زندگی کا کردار بہت اہم ہے۔ رند کی شاعری کے تجزیے میں بھی اُس دور کی لکھنوی تہذیب و فضا پیش نظر رہنی چاہیے۔ آتش و ناسخ کے دور میں اہلِ لکھنؤ کے شعر کی معنوی خوبیوں کے برعکس خارجی مضامین کی طرف توجہ مرکوز کرنے سے خیال و موضوع کا پہلو قدرے عدم توجہی کا شکار ہوا۔ زبان و بیان اور طرزِ ادا جیسے خارجی عناصر شاعری میں مرکزیت حاصل کر گئے۔ موضوعات میں بھی بیش تر خارجیت پر مبنی ہونے کے سبب شاعری میں تصنع کی چھاپ واضح دکھائی دینے لگی۔ احتشام حسین اُس دور کے لکھنوی شعر و ادب اور تہذیب و ثقافت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

> "لکھنؤ کے لیے یہ کہنا اس کے ساتھ ناانصافی ہو گی کہ اس نے محض شعر و ادب کے ایک مخصوص رنگ کو چمکایا۔ لکھنؤ ایک ادبی مرکز یا دبستانِ شاعری ہی نہیں ایک تہذیبی مرکز بھی بن گیا..... عام جاگیر دارانہ زوال اور بیرونی طاقت کے عروج کی روشنی میں اتنا تہذیبی ارتقاء بھی حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے۔ اگر لکھنؤ کے ادبی کارناموں کا مطالعہ اس حیثیت سے کیا جائے تو انشاء، مصحفی اور جرأت کا عہد آہستہ آہستہ دہلی کے معیار سے مٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے جس کی تکمیل ناسخ اور آتش کے ہاتھوں ہوئی۔ زبان کی ایسی تراش خراش، محاورات اور روزمرہ کی ایسی چھان بین، صنائع کے استعمال کی طرف ایسی توجہ شاید ہی کہیں اور کسی دوسرے عہد میں کی گئی ہو گی، نتیجہ یہ ہوا کہ یہی چیزیں لکھنوی شاعری کا طرۂ امتیاز قرار پا گئیں اور یہ بادل اس فضا پر اس طرح سے چھائے کہ شعر و سخن کے چمکتے ہوئے ستارے بھی اسی میں چھپ گئے..... زبان کی صحت، لچک، اور حسنِ استعمال نے عیوب کے بہت سے دھبے دھو دیئے ہیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم رہی کہ یہاں کی شاعری کا بہت بڑا حصہ ادب کی حیثیت سے نہیں زبان کی حیثیت سے مطالعے کی دعوت دیتا ہے"۔[20]

رند نے اسی ادبی ماحول میں مشاعروں میں اپنی سخن وری سے نام کمایا۔ طرحی مشاعروں کی روایت نے بڑے شعراء کی سخن وری کو مزید نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ رند کی غزل گوئی کے نمایاں خصائص میں سوز و گداز، درد و غم، بے ثباتی دنیا، وصل و فراق کے نقشے، حسن و عشق کی کشاکش، معرفت و حقیقت کی رعنائیاں، منازلِ تصوف اور حکیمانہ و فلسفیانہ مباحث شامل ہیں۔ اس پر لطف اُن کی بے مثل، رواں، شستہ و لطیف زبان کا ہے، جس کی چاشنی میں وہ تشبیہ و استعارہ، رعایت لفظی، روزمرہ و محاورہ، ضرب الامثال اور دیگر صنائع بدائع کا برمحل استعمال کرتے ہوئے انتہائی فصاحت کے ساتھ جان دار انداز میں نظم کرتے

ہیں۔ انھوں نے اودھ کے اُس کلاسیکی رنگ سے وفا کی جب وہ میر مستحسن خلیقؔ کے شاگرد تھے اور وفاؔ تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے لکھنوی شاعری کی فرسودہ خارجیت سے اپنے دیوان کو بے رنگ نہیں ہونے دیا بلکہ اس میں فیض آباد کی قدیم فضا اور ماحول مہکتا دکھائی دیتا ہے۔ رندؔ کے کلام میں مبالغہ آرائی، مشکل پسندی، تصنع اور بے جا قافیہ پیمائی کے برعکس طرزِ آتشؔ و میرؔ رچے بسے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ طرزِ میرؔ کے مقلد تھے۔ چناں چہ کہتے ہیں:

شیخ ناسخؔ خواجہ آتشؔ کے سوا بالفعل رندؔ
شاعرانِ ہند میں کہتے ہیں طرزِ میرؔ ہم

رندؔ کی قادر الکلامی کے باوصف اُن کا رنگ میرؔ اختیار کرنا اپنی جگہ اہم ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے میرؔ کی سادگی و پرکاری کی راہ اختیار کی ہے اور اردو شاعری میں چھوٹی بحروں پر مشتمل سہلِ ممتنع کی حامل غزلیں کہی ہیں۔ ان کے دیوان میں ایسی کئی غزلیں موجود ہیں جو انھیں طرزِ میرؔ کے قریب لا کھڑا کرتی ہیں۔ ایسی غزلوں کے چنیدہ اشعار درجِ ذیل ہیں:

کھل جائے گا احوال مرے دل کی جلن کا
کیوں نبض پہ تم ہاتھ مسیحا نہیں رکھتے
مرتے ہیں تمھارے لبِ جاں بخش پہ دونوں
جینے کی ہوس خضر و مسیحا نہیں رکھتے [21]

اور کیا ہو یار کی آنکھوں سے کام
خلق ہیں جادو گری کے واسطے
رنج و اندوہ و ملال و درد و غم
صدمے ہیں یہ آدمی کے واسطے
بے کسی میرے لیے پیدا ہوئی
میں بنا ہوں بے کسی کے واسطے
حشر کے دن رندؔ کو بخشائیو
یا علیؑ روحِ نبیؐ کے واسطے [22]

آگے گے ہم تھے راہِ عشق میں
پیچھے پیچھے خضر پیغمبر چلے [23]

مومنؔ کا مشہور شعر ہے:

شب جو مسجد میں جا پھنسے مومن
رات کاٹی خدا خدا کر کے

رندؔ کے ہاں مصرعِ ثانی بعینہٖ موجود ہے اور اسی ردیف میں غزل بھی موجود ہے۔

ہجر میں تھی کسے امیدِ سحر

رات کاٹی خدا خدا کر کے
قدر میری تجھے نہ تھی صیاد
ہاتھ ملتا ہے کیوں رہا کر کے

ذیل میں رندؔ کی چھوٹی بحروں پر مشتمل غزلوں کے مصرعِ اولیٰ دیئے جا رہے تا کہ اندازہ ہو سکے کہ ان غزلیات میں رندؔ سادگی و سلاست کو بعینہٖ برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ مزید یہ کہ ان غزلیات کو اُن کے کلام کی چنیدہ غزلیات کہا جا سکتا ہے جن سے طرزِ رندؔ متعین کرنے میں بے حد آسانی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں لکھنوی / خارجی لوازم شاعری ان غزلیات سے کوسوں دور ہیں:

ع رخ سے پردہ اٹھا دیا کس نے
ع سانس دیکھی تنِ بسمل میں جو آتے جاتے
ع دل کو کب تک ہجر میں بہلایئے
ع آج گلشن میں کون آتا ہے
ع ہو نہ مایوس ریاضت کا صلہ ملتا ہے
ع دیر آنے میں یار کرتا ہے
ع محبت عناصر میں شامل ہوئی
ع زیست کے دن اپنے پورے کر چلے
ع تصور سے اک شوخ کے گفتگو ہے
ع صحت ہے موت عشق کے آزار کے لیے
ع زمانے میں وہ مہ لقا ایک ہے

تصوف

اردو شاعری میں متصوفانہ عناصر کو دیکھیں تو شعراء کے دو گروہ دکھائی دیتے ہیں۔ اول وہ صوفی مزاج شعراء جنھوں نے رموز ہائے تصوف کے ذریعے اسرارِ حیات و کائنات کو سمجھنے کی سعی کی۔ دوسرا وہ جو "تصوف برائے شعر و سخن خوب است" کے مقولے پر عمل پیرا ہو کر متصوفانہ خیالات کو پیش کرتا ہے۔ ایسے شعراء کے کلام میں صوفی شعراء کی خصوصیات مفقود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیش تر لکھنوی شعراء (ماسوائے آتشؔ) کے ہاں مضامینِ تصوف کے بیان میں روایتی انداز دکھائی دیتا ہے۔ خواجہ حیدر علی آتشؔ قناعت پسند اور بوریا نشین صوفی تھے۔ استغنا، توکل، خاکساری اور فقر کے عناصر اُن کی شاعری میں بہ حسن و خوبی نظم ہوئے ہیں۔ رندؔ نے بھی استاد کی تقلید میں متصوفانہ خیالات کو نظم کیا ہے لیکن وہ زاہد تھے نہ صوفی، درباری ماحول کے سبب درویشی و فقر کے مشاہدات سے وہ کوسوں دور تھے۔ تاہم اُن کے کلام میں جس قدر مضامینِ تصوف بیان ہوئے ہیں اُس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کی ذات میں تصوف کا کوئی دیا روشن تھا جسے جِلا کی ضرورت تھی۔ اگر انھیں صوفیانہ روایت سے علاقہ ہوتا تو وحدت الوجود، وحدت الشہود، اختیار و جبر، معرفتِ نفس، فنائے خودی، ترکِ دنیا اور بے ثباتیِ دنیا جیسے موضوعات اُن کے ہاں اپنی ایک اور آن بان کے ساتھ دکھائی دیتے۔

وحدت الوجود و وحدت الشہود

فلسفۂ وحدت الوجود کے ضمن میں رندؔ ہمہ اوست کے نظریے کا پرچار کیا ہے۔ وحدت الوجود کے ماننے والے کائنات میں خدا کے حسن کے جلوے کو دیکھتے ہیں۔ انسان قطرہ ہے اور دریا میں پہنچ کر مکمل ہو گا یہ دریا دراصل بحرِ وحدت ہے اور بحرِ وحدت ،وحدت الوجود ہے:

جدا بحرِ وحدت سے قطرہ ہوا تھا
سو واصل بدریا ہوا چاہتا ہے
ہوا تحقیق اُن لوگوں سے جو ہیں آپ سے باہر
پتا ملا ہے جب جو یا ترے خود سے گزرتے ہیں[24]

اسی طرح رندؔ نے ذاتِ باری تعالیٰ کی وحدانیت اور فلسفۂ وحدت الشہود پر بھی اظہار خیال کیا ہے۔ دنیا عالم شہود ہے۔ کائنات کی تخلیق کا سبب حسنِ حقیقی کی خود آرائی و خود نمائی ہے۔ گویا مضامینِ تصوف کی بنیاد عشقِ حقیقی پر رکھی گئی ہے۔ جہاں حسن، حسنِ مطلق، معشوق شاہد حقیقی اور عاشق، مخلوق ہے۔ حسنِ ازل پردے کے پیچھے سے کائنات کے ذرّے ذرّے میں جھلک رہا ہے۔ رندؔ نے اسی خیال کو یوں نظم کیا ہے:

دل چسپ مرقع ہے ہر اک نقش یہاں کا
نقشہ کسی استاد نے کھینچا ہے جہاں کا

وحدانیت کے ضمن میں اشعار دیکھیے:

خداوندِ ارض و سما ایک ہے
قسم ہے خدا کی خدا ایک ہے
عدم ابتدا ہے عدم انتہا
مری ابتدا انتہا ایک ہے
ذرا غور سے مرأت دل کو دیکھ
یہ آئینہ حق نما ایک ہے
جنھیں کفر والحاد کہتا ہے شیخ
فقط پھیر ہے راستا ایک ہے[25]

درویشی و فقر کے ضمن میں اشعار دیکھیے:

کریم جو مجھے دیتا ہے بانٹ کھاتا ہوں
مرے طریق میں تنہا خوری حلال نہیں
جو رکھے تو رہوں تیری راہ میں ثابت
ولی نہیں ہوں میں درویش باکمال نہیں
جمیل کے لیے لازم ہے عظمت و جبروت
نہ ہو جلال تو یہ شانِ ذوالجلال نہیں
کریم ذات ہے جس کی میں اس سے سائل ہوں

کسی لئیم سے درویش کا سوال نہیں[26]

مضامینِ تصوف ہی کے ضمن میں ''بوتراب'' ردیف کی غزل لائقِ مطالعہ ہے۔

مضامینِ حسن و عشق

حسن و عشق اردو غزل میں اول درجے کا موضوع ٹھہرتا ہے۔ تصوف دوسرے درجے پر آتا ہے۔ مجاز کو حقیقت کی سیڑھی کہا گیا ہے۔ صوفی شعراء محبوبِ حقیقی کی محبت میں سرشار رہتے ہیں۔ آتشؔ و ناسخؔ کے دور میں قدما کی روایت عشقیہ شاعری کی صورت میں زندہ رکھی گئی۔ اس دور میں حسن و عشق کے مضامین فحش گوئی کی حدود میں داخل ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ رندؔ بھی اسی دور سے متعلق تھے۔ ان کا نصف سے زائد کلام حسن و عشق کی متنوع کیفیات کا آئینہ دار ہے۔ تاہم اس میں خارجی عناصر کی مبتذل کیفیات کی نمود اس دور کے دیگر شعراء کے برعکس اس لیے مختلف ہے کہ اُن کی عشقیہ شاعری کا بڑا حصہ داخلی شاعری پر مبنی ہے۔ رندؔ کی انفرادیت یہ ہے کہ انھوں نے خارجیت پسند معاشرے میں داخلیت یا حقیقت پسندی کو اپنی عشقیہ شاعری کا ذریعۂ اظہار بنایا ہے۔ امداد امام اثر لکھتے ہیں:

> ''ان کی غزل سرائی قابلِ لحاظ ہے شیرینگیِ زبان، خوبیِ بندش، صفائیِ کلام، روانی طبع، پختگیِ مضامین کی صفتیں اس درجہ تمامی دیوان میں آشکارا ہیں کہ جس غزل کو جہاں سے پڑھئے یہ صفتیں اپنے جلوے دکھا رہی ہیں..... رندؔ برخلاف اپنے ملکی رنگ کے بیشتر شاعری کا داخلی پہلو برتتے ہیں اسی لیے ان کی غزلیں غزلیت کا مزا دیتی ہیں۔ اگر ان کے کلام میں خستگی، برشتگی، سوز و گداز، نشتریت، درد، متانت، جلالت وغیرہ کے مواد حسبِ مراد ہوتے تو ان کو دردؔ، میرؔ اور غالبؔ کے ساتھ ہم سری حاصل ہوتی۔ خیر اس پر بھی جیسی ان کی غزل سرائی ہے نہایت غنیمت ہے اور ارباب مذاق کی توجہ کے قابل ہے''۔[27]

کلامِ رندؔ سے حسن و عشق پر مبنی منتخب اشعار درجِ ذیل ہیں:

مٹی دروازے کی اُن کے لیے جاتے ہیں مریض
وقت کے اپنے مسیحا جو بن بیٹھے ہیں

آیئے آیئے مرشد مرے یا حضرت عشق
خونِ دل پینے کو حاضر ہے جگر کھانے کو

رہنما عشق صنم کا ہو تو انشاء اللہ
کعبۃ اللہ پھر کر چلیں بت خانے کو

تازہ ہے لیلیٰ و مجنوں کی کہانی اب تک
لوگ سنتے ہیں ابھی عشق کے افسانے کو

ہم ابتدا ہی سے سمجھے تھے ہو گا بد انجام
بخیر عشق کے آغاز کا مآل نہیں

کہاں کا عشق محبت کسے ہے کیسا پیار
جو قول ہارے ہیں اس کا نباہ کرتے ہیں

اوترک تری آنکھوں پہ عیاری ختم ہے
دونوں نے کیا بلوہ ہزاروں اڑائے دل

تشنہ دکھلاتا ہے ہر خار زباں کے کانٹے
کاش آجائے کوئی آبلہ پا میرے بعد
مر گئے پر نہ چھوڑے گی گدائی مجکو
گور پر برسے گی شان فقر امیرے بعد
رندؔ کی ہے یہ وصیت اسے سب سن رکھیں
پاس تربت میں رہے خاکِ شفا میرے بعد[28]

خمریات

رندؔ کے ہاں خمریات کا موضوع ذاتی تجربہ بن کر جھلکتا ہے۔ پھر انھوں نے اردو غزل کی اس روایت کو اس طور پر نبھایا ہے کہ ان کے دیوان میں شراب ردیف پر ۱۸، اشعار کی غزل بھی موجود ہے۔ خمریات اردو غزل کا مستقل موضوع ہے۔ رندؔ نے اپنے تخلص کی رعایت سے اس موضوع کو دیگر شعراء کی نسبت زیادہ بہتر انداز میں نبھایا ہے۔ اشعار دیکھیے:

ہو گی کیوں کر دل میکش کی تسلی ساتھی
اور دے اور دے رٹ لگ گئی مستانے کو
ساقیا ہم سے تہی دست بھی یہاں جھکتے ہیں
پُر رکھے ساقی کوثر ترے میخانے کو

حشر کے دن دیکھنا بد مستیاں مجھ رندؔ کی
گور سے کہتا اُٹھے یا ساقی کوثر شراب

حشر کو جام مئے جنت پلانا یا علی
ساقی کوثر ہے تو اور میں ہوں رندؔ بادہ نوش[29]

خمریات کے ضمن میں رندؔ کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ اس موضوع کے مجلہ رموز بیان کرنے کے بعد آخر میں ساقیِ کوثر سے ہم کلام ہو جاتے ہیں جس سے اس موضوع کے جملہ عیوب اُس ذات بے عیب کی جانب رجوع کرنے سے تصوف کی سمت بہتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس طرح رندؔ کے ہاں خمریات کا موضوع ساقیِ کوثر کی ساقی گری کا استعارہ بن کر سامنے آتا ہے۔ مذکورہ بالا تینوں اشعار اسی رنگ کے عکاس ہیں۔

لکھنویت / خارجیت

خارجیت کے ضمن میں سطورِ سابقہ میں رندؔ کے بارے میں امداد امام اثر کی رائے نقل کی گئی ہے۔ رندؔ نے اپنے دور کے جملہ خارجی عناصرِ شاعری سے اپنی شاعری کو کسی حد تک پاک رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہاں خارجی مضامین کا بیان تو ہوا ہے لیکن اُن کی مقدار اس قدر نہیں ہے جتنی دیگر لکھنوی شعراء کے ہاں ملتی ہے:

ہنستے ہنستے کھول دیتا ہے اگر جوڑا کبھی
ایسی چھپ جاتی ہے بالوں میں کمر ملتی نہیں
مبتدائے حسنِ کامل کی خبر ملتی نہیں
ہے دہن غائب تمھارا اور کمر ملتی نہیں
حیف اور عیسیٰ نفس تجھ کو خبر ملتی نہیں
نبض اس بیمار کی دو دو پہر ملتی نہیں
تکتے تکتے راہ اس کی تم بھی کیا پتھرا گئیں
اب پلک سے کیوں پلک اے چشم تر ملتی نہیں[30]

ڈاکٹر عبادت بریلوی "غزل اور مطالعہ غزل" میں کلامِ رندؔ کا ذکر خالصتاً خارجیت کے رنگ میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آتشؔ اور ناسخؔ نے مل کر غزل کے لکھنوی انداز کی ایک فضا قائم کی، اس فضا کو ان کے شاگردوں نے خاص طور پر باقی رکھا۔ ایک زمانے تک یہ فضا قائم رہی جو شعراء ان کے بعد اس فضا کو قائم رکھنے میں پیش پیش رہے ان میں رندؔ، صباؔ، وزیرؔ، برقؔ..... خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں..... ان سب کی غزلوں کا کم و بیش وہی انداز ہے جس کا سنگِ بنیاد آتشؔ اور ناسخؔ نے رکھا تھا۔ رکاکت، ابتذال اور رعایتِ لفظی کے عناصر تقریباً سب کے یہاں یکساں طور پر پائے جاتے ہیں..... کوئی بڑا خیال، کوئی پر خلوص جذبہ، کوئی واضح نظریۂ حیات، کسی طرح کا لوچ اور بانکپن ان غزلوں میں پیدا نہیں ہوتا۔"[31]

ڈاکٹر عبادت بریلوی کی مذکورہ رائے کو مجموعی لکھنوی شاعری پر لاگو کیا جائے تو ایسا امکان دکھائی دیتا ہے انفرادی لحاظ سے اُن کی رائے ہر شاعر پر لاگو نہیں ہوتی رندؔ پر تو بالکل نہیں۔

استاد شعراء کی زمینِ غزل میں طبع آزمائی

رندؔ نے متقدمین کی روش پر چلتے ہوئے استاد شعراء کی زمینِ غزل میں طبع آزمائی کی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے میرؔ، دردؔ، آتشؔ، ناسخؔ اور غالبؔ کی زمین میں غزلیں کہی ہیں۔ چند استاد شعراء کی غزل کے اشعار اور رندؔ کی اُسی زمین میں کہی ہوئی غزلوں کے اشعار درجِ ذیل ہیں: غزلِ رندؔ در زمینِ دردؔ

تہمت چند اپنے ذِمے دھر چلے
جس لیے آئے تھے سو ہم کر چلے (دردؔ)

زیست کے دن اپنے پورے کر چلے
تکتے تکتے راہ تیری مر چلے
کر عمل اے رندؔ قولِ دردؔ پر
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

ہر چند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں ناقبول
منہ پھیر لے وہ جس کے مجھے روبرو کریں (دردؔ)

سودائی کر نا زلف کو عشاق کا نصیب
حیران مثال آئینہ، آئینہ رو کریں
مرنے لگوں تو منہ طرفِ کوئے یار ہو
مومن ہوں وقتِ نزع مجھ قبلہ رو کریں
اک بحرِ حسن کے رخِ رنگین کا عشق ہے
ہم کیا نظارۂ چمن و آب جو کریں[32]

غزلِ رندؔ در زمین غالبؔ

حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد (غالبؔ)

کچھ فقط غم ہی نہ دنیا سے گیا میرے بعد
عشق بازی کا بھی چرچا نہ رہا میرے بعد
اپنے مرنے کا مجھے رنج اگر ہے تو یہ ہے
کون اٹھائے گا ترے جور و جفا میرے بعد

صنائع لفظی و معنوی

رندؔ چوں کہ لکھنوی ماحول و فضا میں پروان چڑھے تھے اور اُن کا دور ناسخؔ کی اصلاحِ زبان کا دور کہلاتا ہے۔ اس لیے اُن کے دور تک اردو زبان اپنی بہترین صورت میں موجود تھی۔ اصلاحِ زبان کی تحریک اپنا جوبن دکھا چکی تھی اور رندؔ جیسے قادرالکلام شاعر کے پاس بہترین موقع تھا کہ وہ جملہ لوازم زبان و بیان سے اپنے شعری سرمائے کو آراستہ و پیراستہ کریں اور انھوں نے آتشؔ کی شاگردی میں زبان و بیان کے جملہ لوازم تمام تر باریکیوں سے شاعری کی زینت بنائے۔ ان میں سے چیدہ چیدہ پر بھی نگاہ دوڑائیں تو رعایتِ لفظی اُن میں سرِ فہرست ہے۔ رندؔ کے کُل کلام میں رعایتِ لفظی کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ یہ اُس دور کی لکھنوی شاعری کا طرۂ امتیاز تھی اور رندؔ اس سے کیسے مفر اختیار کر سکتے تھے۔ پھر صنائع بدائع کا برمحل اور برملا استعمال رندؔ کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔ صنائع و بدائع میں تلمیح، تشبیہ، استعارہ اور صنعتِ لف و نشر سرِ فہرست ہیں۔ زبان و بیان کی مذکورہ خوبیوں کا مختصر جائزہ (مع شعری امثلا) درجِ ذیل ہے:

رعایتِ لفظی

محمد اعظم خان لکھتے ہیں: ''اس دور میں رعایتِ لفظی کا التزام لطف و چاشنی کی حد سے گزر کے خبط و جنون کے درجے پر پہنچ گیا تھا۔ جس کی قربان گاہ پر مطالب و معانی سب شہید کر دیئے گئے اور شاعری کو ایک مقفیٰ ضلع جگت بنا کر رکھ دیا..... اس دور کے شعراء

کی شاعری گویا عبارت تھی اسی رعایت لفظی سے..... اس دور کا ہر شاعر کم و بیش اس مرض میں مبتلا نظر آئے گا۔ رندؔ(۱۷۹۷ء۔۱۸۵۷ء)، وزیر (المتوفی ۱۸۵۴ء)، صباؔ(۱۷۶۵ء۔۱۸۵۴ء)..... جو اس عہد کے قابلِ ذکر شعراء ہیں ان سب کا کلام اس صنعت سے اس قدر معمور ہے اور ان کی ساری فکرِ سخن اسی ایک چیز پر اس طرح مرتکز ہو گئی ہے کہ ان کے کلام کا باہم امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔[33]

نہیں بچتا دونوں کا مارا ہوا
تری زلف اور اژدھا ایک ہے

بحرِ ہستی میں فقط مثلِ حباب
ہے مجھے اک دم کی مہلت دیکھ لی
جھولی میں ہیں فقیر کے ٹکڑے یہ بھیک کے
رغبت جو ہو بتوں کو تو حاضر رسوئی ہے
رویا جو میں تو یار کے دل کا مٹا غبار
شبنم نے گردِ عارضِ گل آ کے دھوئی ہے

تلمیح

میرے اشکوں کا غضب طوفان ہے
نام لے کر نوح پیغمبر چلے
ہے عیاں حالِ سنگِ اصحابِ کہف
جانور کی آدمیت دیکھ لی[34]

خلاصۂ بحث

رندؔ اردو شاعری کے اُس دور سے تعلق رکھتے ہیں جسے آتشؔ و ناسخؔ کے اصلاحِ زبان کے دور سے موسوم کیا جاتا ہے۔ سرزمینِ اودھ، لکھنؤ سے تعلق کے سبب زبان و بیان کی جملہ خوبیاں رندؔ کی شاعری کا خاصا ہیں۔ پھر آتشؔ جیسے قلندر اور بڑے شاعر کی شاگردی اور ذاتی لیاقت اور استادانہ مزاج سے اردو شاعری کو لکھنوی شاعری کے دورِ خارجیت کے عروج میں انھوں نے داخلی مضامین کو خونِ نابۂ دل میں ڈبو کر شعری نگینوں کی صورت میں قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ ان کا کلام استاد شعراء کے ساتھ فخراً رکھا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ اس شاعری میں روایت و تقلید کے ساتھ ساتھ تصوف، فلسفہ، اخلاق جیسے خیالاتِ بلند بھی شامل ہیں۔ دہلوی شعراء کے ہاں داخلیت ملتی ہے تو رندؔ کے ہاں داخلیت اور خارجیت دونوں عناصر کا حسین امتزاج ملتا ہے لیکن وہ ابتزال کی حدود کو نہیں چھوتا۔ سادگی و محاورہ بندی اُن کی زبان کی عمومی خصوصیت ہے جس کے باوصف اُن کی شاعری ہمیشہ اہلِ نقد سے داد وصول کرتی رہے گی۔

References

[1] Mirzā Hassam al-Dīn Haider Khān, *Diwān-e-Namī,* Akbar, ed. Dr. Haidrī Kashmīrī (Srīnagar: Narising Garh Kashmīr, 1972AD), 25.

[2] Ruqayya Jaferī, *Nawāb Sayed Muhammad Khān Rind,* (Lakhnow: Nusrat Publishers, 1996AD), 59.
[3] Rām Babū Saksēna, *Tarikh-e-Adab-e-Urdū* (New Dehlī: Bazm-e-Khizr-e-Rāh, 2000AD), 221.
[4] Rind Lakhnawī, *Diwan-e-Rind Maroof be Guldasta-e-Ishq,* (Lakhnow: Munshi Nawal Kishore Press, 1931AD) 242, 243
[5] Sayed Ehtisham Hussain, *Afkaro Masayal,* (Lakhnow: Naseem Book depot, 1963AD), 97,98.
[6] Rind Lakhnawī, *Diwān-e-Rind*, 243.
[7] Sayed Suleman Ḥussain, Lakhnow key *Chand Nāmwar Shoarā* (Lakhnow: Uttarpardesh Urdu Academy, 1973 AD), 1:155.
[8] Rām Babū Saksēna, *Tarikh-e-Adab-e-Urdū, 222*
[9] Shah ʻAbd al-Salām, *Dabistān-e-Ātish* (New Dehli: Maktaba Jamia Ltd, 1977AD), 118.
[10] ʻAlī Jawād Zaidī, *Intikhab-e-Rind* (Lakhnow: Uttarpardesh Urdu Academy, 1983AD), 16.
[11] Suleman Ḥussain, Lakhnow key *Chand Nāmwar Shoarā*, 1:154-155.
[12] Lāla Sirī Rām, *Khum Khana-e-Javēd* (Dillī: Dillī printing Works, 1917AD), 518-519.
[13] ʻAbd al-Ghafoor Nasākh, *Tazkara-e-Sukhn-e-Shoarā,* (Patna: Azeem us-Shan Book Depot, 1972AD), 85.
[14] Sirī Rām, *Khum Khana-e-Javēd,* 519-520.
[15] Suleman Ḥussain, Lakhnow key *Chand Nāmwar Shoarā*, 1:151-152.
[16] Molvī Muhammad Mubeen Kaifī Chiryā Kotī, *Jawāhir-e-Sukhan* (Allahābad: Hindustānī Academy, n.d), 3:499.
[17] Munshī Ameer Ahmed, *Tazkara'-e-Rind* (Lakhnow: Anwār-ul-Matabé, n.d), 66.
[18] Ameer Ahmed, *Tazkara'-e-Rind,* 67.
[19] Ameer Ahmed, *Tazkara'-e-Rind,* 67-68.
[20] Sayed Ehtishām Ḥussain, *Afkār-o-Masāya'l,* 99-100.
[21] Rind Lakhnawī, *Diwān-e-Rind*, 290-291.
[22] Rind Lakhnawī, *Diwān-e-Rind*, 273.
[23] Rind Lakhnawī, *Diwān-e-Rind*, 162.
[24] Rind Lakhnawī, *Diwān-e-Rind*, 207-296.
[25] Rind Lakhnawī, *Diwān-e-Rind*, 286.
[26] Rind Lakhnawī, *Diwān-e-Rind*, 265.
[27] Imdād Imām ʻAṣar, *Kashiful Haqayaq,* ed. Dr. Wahāb Ashrafī (New Dehli: Tarqī-e Urdu Beūrū, 1982AD), 458-459.
[28] Rind Lakhnawī, *Diwān-e-Rind*, 87,269,263,261,260,257,258.
[29] Rind Lakhnawī, *Diwān-e-Rind,* 269,39,68.
[30] Rind Lakhnawī, *Diwān-e-Rind*, 266.
[31] Dr. Ibādat Barelvī, *Ghazal or Muṭāl'a Ghazal* (Alī-Garh: Educational Publishing House, 1983 AD), 351.
[32] Rind Lakhnawī, *Diwān-e-Rind*, 88,162.
[33] Muhammad Ā'zam Khān, *Darbār-e-Awadh kā Aṣar Urdū Shā'erī Par* (n.d), 36.
[34] Rind Lakhnawī, *Diwān-e-Rind,* 286,272,281,162,272.